اُردو، ہندی، ہندوستانی (۱)

یہ سبھی مانتے ہیں، کہ قومی استحکام کے لئے معاشرتی اتحاد لازمی ہے، اور کسی قوم کی زبان اور رسم الخط اس معاشرتی اتحاد کا ایک خاص جزو ہے۔ محترمہ خالدہ ادیب خانم نے اپنی ایک تقریر میں ترکی قوم کے اتحاد کو ترکی زبان سے منسوب کیا ہے۔ اور یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ قومی زبان کے بغیر کسی قوم کا وجود ہی ذہن میں نہیں آتا۔ جب تک ہندوستان کی کوئی قومی زبان نہیں ہے وہ قومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ زمانہ قدیم میں ہندوستان ایک قوم رہا ہو، لیکن بودھوں کے زوال کے بعد اس کی قومیت بھی فنا ہو گئی اور حالاں کہ معاشرتی یک رنگی موجود تھی لیکن اختلاف زبان نے اس تفریق کے عمل کو اور بھی آسان کر دیا۔ اسلامی دور میں بھی جو کچھ ہوا۔ وہ مختلف صوبوں کا سیاسی اجتماع تھا۔ قومیت کا وجود نہ تھا۔ حق تو یہ ہے کہ قوم کا خیال مقابلتاً زمانہ حال کی ایجاد ہے۔ جس کی عمر تقریباً دو ۲۰۰ سو سال سے زیادہ نہیں۔ ہندوستان میں قوم کی ابتدا انگریزی تسلط کے ساتھ شروع ہوئی، اور اسی کے استحکام کے ساتھ اس کی ارتقا ہو رہی ہے۔ لیکن اس وقت تک بجز سیاسی محکومیت کے ملک کے مختلف عناصر میں کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے جو انھیں منظم کر کے ایک قوم بنا دے۔ اگر آج انگریزی حکومت اٹھ جائے تو بہت ممکن ہے کہ ان عناصر میں جو اتحاد نظر آ رہا ہے وہ افتراق کی صورت اختیار کرے۔ اور مختلف زبانوں کی بنا پر ایک نیا دستوری نظام پیدا ہو جائے۔ جس کا ایک دوسرے

سے کوئی تعلق نہ ہو، اور پھر وہی کشمکش شروع ہو جائے جو انگریزوں کے آنے سے پہلے تھی۔ اس لئے قوم کی بقا کے لئے لازمی ہے کہ ملک میں معاشرتی اتحاد ہو اور چوں کہ زبان اس اتحاد کا ایک خاص رکن ہے ضروری ہے کہ ہندوستان کی ایک قومی زبان ہو، جو ملک کے ایک سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جائے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ دنوں میں قومی ادب کی تدوین بھی شروع ہو جائے گی۔ اور ایک زمانہ وہ آئے گا جب اقوام کی ادبی مجلس میں ہندوستانی زبان مساویانہ حیثیت سے شریک ہونے کے قابل ہو جائے لیکن اس قومی زبان کی صورت کیا ہو۔ صوبہ جات کی مروجہ زبانوں میں تو قومی زبان بننے کی صلاحیت نہیں کیوں کہ ان کا دائرہ عمل محدود ہے۔ ایک ہی زبان ہے کہ جو ملک کے بڑے حصّے میں بولی اور اس سے بڑے حصّے میں سمجھی جاتی ہے۔ اور اسی کو قومی زبان کا درجہ دیا جا سکتا ہے مگر اس وقت اس کی تین صورتیں ہیں۔ اردو ہندو اور ہندوستانی۔ اور ابھی تک قومی طور پر طے نہیں کیا جا سکا کہ ان میں کون سی صورت میں زیادہ مقبول اور زیادہ آسانی سے مروج ہو سکتی ہے؟ تینوں ہی صورتوں کے موید موجود ہیں۔ اور ان میں کھینچا تانی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اس اختلاف کو سیاسی رنگ دے دیا گیا ہے۔ اور ہم اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل اور دماغ سے غور کرنے کے ناقابل ہو گئے ہیں۔

لیکن ان رکاوٹوں کے باوجود ہمیں چاہیے کہ ہندوستانی قومیت کی منزل کو ناقابل حصول سمجھ کر ہمت نہ ہار بیٹھیں۔ ہمیں اس مسئلہ کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ہے۔

ملک میں ایسے ادیبوں کی تعداد کم نہیں ہے جو اردو اور ہندی کی انفرادی نشو نما میں حارج نہیں ہونا چاہتے۔ انہوں نے یہ مان لیا ہے کہ ابتدا میں اپنی دونوں صورتوں میں جو کچھ یکسانیت رہی ہو، لیکن اس وقت دونوں کی دونوں جس راستے پر جا رہی ہیں اس میں اتصال ہونا غیر ممکن ہے۔ ہر ایک زبان میں

ایک فطری رجحان ہوتا ہے۔ اردو کو فارسی اور عربی سے فطری مناسبت ہے۔ ہندی کو سنسکرت اور پراکرت سے۔ اس رجحان کو ہم کسی طاقت سے بھی روک نہیں سکتے۔ پھر ان دونوں کو باہم ملانے کی کوشش میں کیوں ان دونوں کو نقصان پہنچائیں۔

اگر اردو اور ہندی دونوں اپنے کو اپنے مولد و مسکن تک ہی محدود رکھیں تو ہمیں ان کی فطری نشو و نما سے کوئی اعتراض نہ ہو۔ بنگالی، مہرہٹی، گجراتی، تامل تلنگی، کنڑی وغیرہ، ان صوبہ جاتی زبانوں کے متعلق ہمیں کوئی پریشانی نہیں۔ انہیں اختیار ہے اپنے اندر چاہے جتنی سنسکرت، عربی یا لاطینی بھریں۔ ان کے اہل قلم خود اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اردو اور ہندی کی نوعیت جدا ہے۔ یہاں تو دونوں ہی ہندوستان کی قومی زبان کہلانے کی مدعی ہیں۔ مگر چونکہ اپنی انفرادی صورت میں وہ قومی ضرورتوں کی تکمیل نہ کر سکیں اس لئے اضطراری طور پر خود بخود ان کے اتصال کا عمل شروع ہو گیا۔ اور وہ متحدہ صورت پیدا ہو گئی، جسے ہم ہندوستانی زبان کہنے میں حق بجانب ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان نہ تو وہ اردو ہو سکتی ہے جو عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ سے گراں بار ہے۔ اور نہ وہ ہندی جو سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے لدی ہوئی ہے۔ اگر آج دونوں مسلکوں کے وکیل آمنے سامنے کھڑے ہو کر اپنی اپنی تحریری زبان میں بات کریں تو شاید ایک دوسرے کا مفہوم مطلق نہ سمجھیں۔ ہماری قومی زبان تو وہی ہو سکتی ہے۔ جس کی بنیاد عمومیت پر قائم ہو۔ وہ اس کی پرواہ کیوں کرنے لگی کہ فلاں لفظ سے اس لئے احتراز کیا جائے کہ وہ فارسی ہے یا عربی یا سنسکرت۔ وہ صرف یہ معیار اپنے سامنے رکھتی ہے کہ اس لفظ کو عوام سمجھ سکتے ہیں یا نہیں، اور عوام میں ہندو مسلمان، پنجابی بنگالی مرہٹی، گجراتی سب ہی شامل ہیں۔ اگر کوئی لفظ یا محاورہ یا اصطلاح مروج عام ہے تو وہ اس کے مخرج اور مولد کی پرواہ نہیں کرتی۔ یہی ہندوستانی ہے۔ اور جس طرح انگریزوں کی زبان انگریزی، جاپان کی جاپانی، ایران کی ایرانی، چین

کی چینی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی قومی زبان کو اسی وزن پر ہندوستانی کہنا مناسب ہی نہیں بلکہ لازمی ہے اگر اس ملک کو ہندوستان نہ کہہ کر صرف ہند کہیں تو اس کی زبان کو ہندی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کی زبان کو اردو تو نہیں کہا جا سکتا۔ تاوقتیکہ ہم ہندوستان کو اردوستان نہ کہنے لگ جائیں، جو اب ممکنات سے خارج ہے۔ قدما یہاں کی زبان کو ہندی ہی کہتے تھے، اور خسرو نے خالق باری تصنیف کر کے ہندوستانی کی بنیاد ڈالی۔ ان کا منشا اس تصنیف سے غالباً یہی ہو گا۔ کہ عام صورت کے الفاظ دونوں صورتوں میں عوام کو سکھلا دیے جائیں تاکہ انہیں اپنے روزمرہ کے تعلقات میں سہولت ہو جائے۔ اردو کی تخلیق کب اور کہاں ہوئی ہے؟ اس کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا۔ بہرحال ہندوستان کی قومی زبان نہ اردو ہے، نہ ہندی، بلکہ ہندوستانی ہے۔ جو سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے۔ اور بڑے حصے میں بولی جاتی ہے لیکن لکھی کہیں نہیں جاتی۔ اور اگر کوئی لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اردو اور ہندی کے ادیب اسے ٹاٹ باہر کر دیتے ہیں۔ دراصل اردو اور ہندی کی ترقی میں جو چیز سدِ راہ ہے۔ وہ ان کی خواص پسندی ہے۔ ہم اردو لکھیں یا ہندی، عوام کے لئے نہیں لکھتے، بلکہ ایک محدود طبقہ کے لئے لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہماری ادبی تصانیف کو حسن قبول نہیں حاصل ہوتا۔ یہ بالکل درست ہے کہ ملک میں بھی تحریری اور تقریری زبانیں ایک نہیں ہوتیں۔ جو انگریزی ہم کتابوں اور اخباروں میں پڑھتے ہیں وہ کہیں بھی نہیں بولی جاتی۔ پڑھے لکھے لوگ بھی تحریری زبان میں گفتگو نہیں کرتے اور عوام کی زبان تو بالکل الگ ہوتی ہے۔ لیکن انگلینڈ کے ہر ایک پڑھے لکھے آدمی سے یہ توقع ضرور کی جاتی ہے کہ وہ تحریری زبان سمجھے۔ اور موقع پڑنے پر اس کا استعمال بھی کر سکے۔ یہی ہم ہندوستان میں بھی چاہتے ہیں۔

مگر آج کیا کیفیت ہے؟ ہمارا ہندی اسکول تلا ہوا ہے۔ کہ وہ غیر ہندی الفاظ کو ہندی میں کسی طرح داخل نہ ہونے دے گا۔ اسے "منشیہ" سے محبت ہے

مگر آدمی سے قطعی نفرت۔ درخواست مروج عام ہونے کے باوجود، اس کے یہاں ممنوع ہے۔ اس کے بجائے وہ "پرارتھنا" کا قائل ہے۔ حالانکہ عوام اس کا مفہوم بالکل نہیں سمجھتے۔ "استعفیٰ" کو وہ کسی طرح قبول نہیں کر سکتا۔ اس کے بجائے وہ "تیاگ پتر" چاہتا ہے۔ ہوائی جہاز کتنا ہی عام فہم ہو، لیکن اسے "دایو یان" کی سیر ہی پسند ہے۔ اردو اسکول اس سے بھی زیادہ چھوت چھات کا دلدادہ ہے۔ وہ خدا کا تو معتقد ہے مگر "ایشور" سے منکر، "قصور" تو وہ کتنے ہی کرتا ہے، مگر "اپرادھ" کبھی نہیں کر سکتا۔ خدمت تو اسے بہت پسند ہے مگر "سیوا" ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس طرح ہم نے اردو اور ہندی کے دو الگ الگ کیمپ بنا لئے ہیں۔ اور مجال نہیں کہ ایک کا کوئی فرد دوسرے کے حدود میں داخل ہو سکے۔ اس اعتبار سے اردو مقابلتاً ہندی سے کہیں زیادہ سخت گیر واقع ہوئی ہے۔ ہندوستانی اس چہار دیواری کو توڑ کر دونوں میں ربط ضبط پیدا کر دینا چاہتی ہے۔ تاکہ دونوں ایک دوسرے کے گھر بے تکلف آجا سکیں۔ محض مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ گھر کے آدمی کی طرح۔ گارسین دتاسی کے الفاظ میں اردو اور ہندی کے درمیان کوئی ایسی حد فاصل نہیں کھینچی جا سکتی، جہاں ایک کو مخصوص طور پر ہندی اور دوسرے کو اردو کہا جا سکے۔ انگریزی زبان کے مختلف رنگ ہیں۔ کہیں لاطینی اور یونانی الفاظ کی کثرت ہوتی ہے، کہیں اینگلو سکیسن الفاظ کی، مگر ہیں دونوں انگریزی۔ اسی طرح اردو یا ہندی الفاظ کے اختلاف کے باعث دو مختلف زبانیں نہیں ہو سکتیں۔ جو لوگ ہندوستانی قومیت کا خواب دیکھتے ہیں جو اس میں معاشرتی اتحاد کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں، ان سے ہماری التجا ہے کہ وہ ہندوستانی کی دعوت قبول کریں۔ جو کوئی نئی زبان نہیں ہے بلکہ اردو اور ہندی کی قومی صورت ہے۔

صوبہ متحدہ کے اپر پرائمری اسکولوں میں درجہ چہارم تک مشترکہ زبان یعنی ہندوستانی کی ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں، صرف رسم الخط جدا ہوتا ہے۔ زبان

میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ صیغہ تعلیم کا منشا یہ ہوگا کہ اس طرح سے طلباء میں بچپن سے ہندوستانی کی بنیاد پڑ جائے گی، اور وہ عام ہندی اور اردو الفاظ سے مانوس ہو جائیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ایک ہی مدرس تعلیم دے سکتا تھا۔ اس وقت بھی یہی نصاب نافذ ہے۔ لیکن ہندی اور اردو کے حامیوں کی جانب سے شکایتیں شروع ہو گئیں ہیں کہ مشترکہ زبان کی تعلیم سے طلباء کی ادبی استعداد کچھ نہیں ہونے پاتی۔ اور وہ اپر پرائمری کے بعد بھی معمولی کتابیں تک نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اس شکایت کو رفع کرنے کے لئے ان عام ریڈروں کے علاوہ اپر پرائمری درجوں کے لئے ایک ادبی ریڈر بھی مقرر ہوئی۔ ہمارے رسالے اور اخبارات اور کتابیں خالص اردو یا خالص ہندی میں شائع ہوتے ہیں اس لئے جب تک اردو لڑکوں کے پاس فارسی اور عربی الفاظ کا اور ہندی لڑکوں کے پاس سنسکرت الفاظ کا کافی ذخیرہ نہ موجود ہو، وہ کوئی اردو یا ہندی کی کتاب نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح بچپن ہی سے ہمارے یہاں اردو ہندی کی تفریق شروع ہو جاتی ہے۔ کیا اس تفریق کو مٹانے کی کوئی ترکیب نہیں ہے۔

جو لوگ تفریق کے حامی ہیں ان کے پاس اپنے دعوے کی دلیلیں موجود ہیں۔ مثلاً خالص ہندی کے وکیل کہتے ہیں کہ سنسکرت کی طرف جھکنے سے ہندی زبان ہندوستان کی دوسری صوبہ جاتی زبانوں کے قریب ہو جاتی ہے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اسے بنے بنائے الفاظ مل جاتے ہیں، تحریر میں ادبیت آجاتی ہے، وغیرہ۔ علیٰ ہذا اردو کے علم بردار کہتے ہیں کہ فارسی عربی کی طرف جھکنے سے ایشیا کی دوسری زبانیں مثلاً فارسی، عربی اردو کے قریب آجاتی ہیں۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اسے عربی کا علمی خزانہ معلوم ہو جاتا ہے۔ جس سے زیادہ علمی زبان دوسری نہیں۔ اور طرز انشاء میں متانت اور شکوہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وغیرہ۔ اس لئے کیوں نہ ان دونوں کو اپنے ڈھنگ پر چلنے دیا جائے؟ اور انہیں باہم ملا کر کیوں دونوں کے راستے میں روکاوٹیں پیدا کی جائیں۔ اگر سبھی اس استدلال سے متفق ہو جائیں تو

اس کے معنی یہی ہوں گے کہ ہندوستان میں کبھی قومی زبان کا ارتقا نہ ہوگا۔ اس لیے ہمیں لازم ہے کہ حتی الامکان اس ذہنیت کو دور کر کے ایسی فضا پیدا کریں جس سے ہم روز بہ روز قومی زبان کے قریب تر پہنچتے جائیں۔ اور ممکن ہے دس بیس سال کے بعد ہمارا خواب حقیقت میں تبدیل ہو جائے۔

ہندوستان کے ہر ایک صوبہ میں مسلمانوں کی کم و بیش تعداد موجود ہے۔ صوبہ متحدہ کے علاوہ اور بھی شہروں میں مسلمانوں نے ہر ایک صوبہ کی زبان اختیار کر لی ہے بنگال کا مسلمان بنگلا بولتا ہے اور لکھتا ہے۔ گجرات کا گجراتی، میسور کا کناری، مدراس کا تامل، پنجاب کا پنجابی، وغیرہ، یہاں تک اس نے اپنے اپنے صوبہ کا رسم الخط بھی اختیار کر لیا ہے۔ اردو خط اور زبان سے اسے تعلق ہو سکتا ہے، لیکن روزمرہ کی زندگی میں اسے اردو کی ضرورت بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ اگر دیگر صوبہ جات کے مسلمان ان صوبوں کی زبانیں بے تکلف سیکھ سکتے ہیں اور انہیں یہاں تک اپنی بنا سکتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں مطلق امتیاز نہیں رہتا تو صوبہ متحدہ اور پنجاب کے مسلمان کیوں ہندی سے اس قدر متنفر ہیں۔ ہمارے صوبے کے دیہاتوں میں رہنے والے مسلمان بالعموم دیہاتیوں کی زبان بولتے ہیں۔ بہت سے مسلمان جو دیہاتوں سے آکر شہروں میں آباد ہو گئے وہ بھی گھروں میں دیہاتی زبان ہی استعمال کرتے ہیں۔ بول چال کی ہندی سمجھنے میں نہ عام مسلمانوں کو کوئی دقت ہوتی ہے نہ بول چال کی اردو سمجھنے میں عام ہندوؤں کو۔ بول چال کی ہندی اور اردو قریب قریب یکساں ہیں۔ ہندی کے ان الفاظ کی تعداد جو عام کتابوں اور اخباروں میں مروج ہیں اور کبھی کبھی پنڈتوں کی تقریروں میں بھی آجاتے ہیں دو ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ علیٰ ہذا فارسی کے عام الفاظ بھی اس سے زیادہ نہ ہوں گے کیا اردو کے موجودہ لغات میں دو ہزار ہندی الفاظ کا اضافہ اور ہندی کے لغات میں دو ہزار اردو الفاظ کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس طرح ہم ایک مشترکہ لغت کی تدوین نہیں کر سکتے؟ کیا ہمارے حافظہ پر یہ بار ناقابل

برداشت ہوگا؟ ہم انگریزی کے بے شمار الفاظ یاد کر سکتے ہیں۔ محض ایک عارضی غرض کی تکمیل کے لیے تو کیا ہم ایک دیرپا مقصد کے لیے تھوڑے سے الفاظ بھی نہیں یاد کر سکتے؟ اردو اور ہندی زبانوں میں ابھی نہ وسعت ہے نہ پختگی۔ ان کے الفاظ کی تعداد محدود ہے۔ اکثر معمولی مطالب ادا کرنے کے لیے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ اس اضافہ سے یہ شکایت دور ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کی سبھی زبانیں بے واسطہ یا بالواسطہ سنسکرت سے نکلی ہیں۔ گجراتی مرہٹی، بنگالی میں تو رسم الخط بھی ہندی سے ملتا جلتا ہے۔ دکھن کی زبانوں میں بھی رسم الخط کے بالکل جدا ہوتے ہوئے سنسکرت الفاظ کی آمیزش بہت زیادہ ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ بھی صوبہ جاتی زبانوں میں کچھ نہ کچھ ملتے ہیں، لیکن اتنی کثرت سے نہیں جتنی کہ ہندی میں۔ اس لیے یہ بالکل درست ہے کہ ایسی ہندی جس میں سنسکرت الفاظ زیادہ ہوں۔ ہندوستان میں آسانی سے مقبول ہو سکتی ہے۔ دیگر صوبوں کے مسلمان بھی اس قسم کی ہندی کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں فارسی اور عربی سے گراں بار اردو کے لیے صوبہ متحدہ اور پنجاب کے شہروں اور قصبوں اور حیدرآباد کے بڑے شہروں کے سوا اور کوئی دائرہ نہیں۔ مسلمان تعداد میں ضرور آٹھ کروڑ ہیں، لیکن اردو بولنے والے مسلمان اس کے ایک چوتھائی زیادہ نہ ہوں گے۔ تو کیا اعلیٰ قومیت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اردو میں کچھ ضروری ترمیم اور اضافہ کر کے اسے ہندی سے متصل کر لیں، اور ہندی میں اسی طرح کے اضافے کر کے اسے اردو سے ملا دیں۔ اور ایک مشترکہ زبان کو مستحکم کر دیں جو سارے ہندوستان میں سمجھی اور بولی جائے۔ اب ہمارے مصنفین، جو کچھ لکھیں، وہ ایک مخصوص طبقہ کے لیے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے لیے ہو۔ سندھی زبان اسی قسم کی آمیزش کی بہت اچھی مثال ہے۔ سندھی رسم الخط ہی عربی ہے حالانکہ اس میں ہندی کے سبھی اصوات شامل کر لیے گئے ہیں۔ اور الفاظ میں جو سنسکرت، عربی اور فارسی کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ کہیں

بھونڈا پن یا ثقالت کا احساس نہیں ہوتا۔ ہندو ستانی کے لئے بھی کچھ اسی طرح کی آمیزش کی ضرورت ہے۔

تفریق کے حامیوں کی یہ دلیل بڑی حد تک صحیح ہے کہ مشترکہ زبان میں قصے کہانیاں اور ڈرامے تو لکھے جا سکتے ہیں، لیکن علمی مضامین اس زبان میں نہیں ادا کیے جا سکتے۔ وہاں تو مجبوراً مفرس اور معرب اردو اور سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال ضروری ہو جائے گا۔ علمی مضامین کے ادا کرنے میں سب سے بڑی ضرورت موزوں اصطلاحات کی ہوتی ہے اور اصطلاحات کے لئے ہمیں مجبوراً عربی اور سنسکرت کے لامحدود ذخائر کے سامنے دست سوال پھیلانا ہوگا۔ اس وقت ہر ایک صوبہ جاتی زبان علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی اصطلاحیں مرتب کر رہی ہے۔ اردو میں بھی علمی اصطلاحات بنائی گئی ہیں۔ اور ابھی یہ عمل جاری ہے۔ کیا یہ کہیں بہتر ہوگا کہ مختلف صوبہ جاتی انجمنیں مجموعی مشورے اور امداد سے اس اہم کام کو سر انجام دیں۔ اس سے فرداً فرداً جو کاوش اور دماغ ریزی اور وقت صرف کرنا پڑ رہا ہے اس میں بہت کچھ بچت ہو سکتی ہے۔

ہمارے خیال میں تو بجائے اس کے کہ نئے سرے سے اصطلاحات بنائیں جائیں یہ کہیں بہتر ہے کہ انگریزی کی مروجہ اصطلاحیں ضروری ترمیم کے ساتھ لے لی جائیں۔ یہ اصطلاحیں محض انگریزی میں مروج نہیں ہیں۔ بلکہ قریب قریب سبھی ترقی یافتہ زبانوں میں ان سے ملتی جلتی اصطلاحیں پائی جاتی ہیں، کہتے ہیں کہ جاپانیوں نے یہی طرز عمل اختیار کیا ہے۔ اور مصر میں بھی خفیف ترمیموں کے ساتھ انھیں لے لیا گیا ہے۔ اگر ٹین اور لالٹین اور بائسکل اور دیگر صدہا غیر ملکی الفاظ ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں۔ تو اصطلاحوں کو لینے میں کون سا امر مانع ہو سکتا ہے۔ اگر ہر ایک صوبہ نے اپنی اپنی اصطلاحیں علیحدہ بنائیں تو ہندوستان کی کوئی قومی علمی زبان نہ بن سکے گی۔ بنگلہ مرہٹی، گجراتی، کناری وغیرہ زبانیں سنسکرت کی مدد سے اس مشکل کو حل کر سکتی ہیں۔ اردو بھی عربی اور فارسی کی مدد سے اپنی اصطلاحی ضرورتیں پوری کر سکتی

ہے لیکن ایسے الفاظ ہمارے لیے مروجہ انگریزی اصطلاحوں سے بھی زیادہ غیر مانوس ہوں گے۔ آئین اکبری نے ہندو فلسفہ اور موسیقی اور عروض کے لئے سنسکرت کی مروجہ اصطلاحوں کو اختیار کر کے اس کی مثال قائم کر دی ہے۔ اسلامی فلسفہ اور دینیات اور عروض میں ہم موجودہ عربی اصطلاحوں کو اختیار کر سکتے ہیں۔ جو علوم مغرب سے اپنی اپنی اصطلاحیں لے کر آئے ہیں۔ انھیں بھی ہم قبول کر لیں تو ہماری تاریخی روایات سے بعید نہ ہوگا۔

یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ مخلوط ہندوستانی اتنی فصیح اور لطیف نہ ہوگی۔ لیکن لطافت اور فصاحت کا معیار ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اچکن پر انگریزی ٹوپی کسی سال پہلے بے جوڑ اور مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھی، لیکن اب وہ معمولی نظارہ ہے۔ عورت کے لیے گیسو حسن کے ایک خاص رکن ہیں۔ لیکن اب تراشے ہوئے بال مقبول ہو رہے ہیں۔ پھر کسی زبان کی صفت محض اس کی فصاحت نہیں ہے۔ بلکہ مطالب ادا کرنے کی قابلیت ہے۔ لطافت اور فصاحت کی قربانی کر کے بھی اگر ہم اپنی قومی زبان کا دائرہ وسیع کر سکیں۔ تو ہمیں اس میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ جب سیاسی دنیا میں فیڈریشن کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ تو کیوں نہ ہم ادبی دنیا میں ایک فیڈریشن قائم کریں، جس میں ہر ایک پردانشل زبان کے نمایندے سال میں ایک بار ایک ہفتہ کے لئے کسی مرکزی مقام پر جمع ہو کر قومی زبان کے مسئلہ پر تبادلہ خیالات کریں۔ اور تجربہ کی روشنی میں سامنے آنے والی مشکلات کو حل کریں۔ جب ہماری زندگی کے ہر ایک شعبہ میں تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں، اور اگر ہماری مرضی کے خلاف، تو زبان کے معاملے میں ہم کیوں ایک سو سال قبل کے خیالات اور نظریات پر قائم رہیں؟ اب موقع ہے کہ ایک آل انڈیا ہندوستانی زبان اور ادب کی انجمن قائم کی جائے جس کا کام ہندوستانی زبان کا وہ ارتقا ہو جس سے وہ سرایک صوبہ میں مقبول ہو سکے۔ اس انجمن کے فرائض اور مقاصد کیا ہوں گے؟ اس پر یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں، یہ اس انجمن کا کام ہے

کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیئے اپنا پروگرام مرتب کرے۔ ہماری تو یہی گزارش ہے کہ اب اس کارِ خیر میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔

(زمانہ اپریل ۱۹۳۵ء)

اُردو، ہندی، ہندوستانی (۲)

میں یہاں ہندی بھاشا کی ات پتی (پیدائش) اور وکاس کی کتھا نہیں کہنا چاہتا۔ وہ ساری کتھا بھاشا وگیان کی پوتھیوں میں لکھی ہوئی ہے۔ ہمارے لیئے اتنا جاننا کافی ہے کہ آج ہندوستان کے پندرہ سولہ کروڑ لوگوں کے بیٹھہ ویوہار اور ساہیتہ کی یہ ہی بھاشا ہے۔ ہاں وہ لکھی جاتی ہے۔ دو لپیوں میں اور اسی اعتبار سے ہم اسے اردو یا ہندی کہتے ہیں۔ پر ہیں وہ ایک ہی۔ بول چال میں تو اس میں بہت فرق ہے۔ ہاں لکھنے میں وہ فرق بڑھ جاتا ہے۔ بھاشا کے وکاس میں ہماری سنسکرتی (تہذیب) کی چھاپ ہوتی ہے۔ اور جہاں سنسکرتی میں بھید یعنی فرق ہوگا۔ وہاں بھاشا میں بھید ہونا سوابھاوک (امکانی یا فطری) ہے۔ جس بھاشا کا ہم اور آپ ویوہار (استعمال) کر رہے ہیں۔ وہ دہلی پرانت کی بھاشا ہے۔ اسی طرح جیسے برج بھاشا، اودھی، میتھلی، بھوج پوری اور مارواڑی (وغیرہ) بھاشائیں الگ الگ چھیتروں میں بولی جاتی ہیں۔ اور سبھی ساہیتک (ادبی) بھاشا رہ چکی ہیں۔ ہندی کے وکاس کے پہلے برج بھاشا ہی ہماری ساہیتک بھاشا تھی۔

لہ پریم چند نے ہندی، اردو اور ہندوستانی کے مسئلہ پر متعدد مضامین لکھے ہیں۔ یہ مضمون اس خطبہ سے لیا گیا ہے۔ جو انہوں نے ۱۹۳۶ء میں آریہ سماج کے انٹر گنت آریہ بھاشا کے سالانہ جلسہ میں لاہور پڑھا تھا۔ یہ خطبہ ہندوستانی میں تھا جسے ڈاکٹر تصدق حسین نے اردو رسم الخط میں تبدیل کر کے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ (عتیق احمد)

تو کیا ایک برج بھاشا، اودھی، بھوج پوری آدی (وغیرہ) کو پیچھے ہٹا کر ہندی کیسے سب کے اوپر غالب آئی؟ یہاں تک کہ اب اودھی اور بھوج پوری کا تو ساہتیہ میں کہیں ویوہار نہیں۔ ہاں برج بھاشا کو ابھی تک تھوڑے سے لوگ سینے سے چپکائے ہوئے ہیں۔ ہندی کو یہ گورو (اعزاز) پردان کرنے کا آشرے مسلمانوں کو ہے۔ مسلمانوں نے ہی دلی پرانت کی اس بولی کو جس کو اس وقت بھاشا کا پد نہ ملا تھا، ویوہار (استعمال) میں لاکر اسے دربار کی بھاشا بنا دیا۔ اور دلی کے امراء اور سامنت جن پرانتوں میں گئے، ہندی بھاشا کو ساتھ لیتے گئے۔ انہیں کے ساتھ وہ دکن میں پہنچی اور اس کا بچپن دکن ہی میں گزرا۔ دلی میں بہت دنوں اراجکتا (طوائف الملوکی) کا زور رہا۔ اور بھاشا کو وکاس کا اوسر (موقع) نہ ملا اور دکن میں وہ پلتی رہی۔ مسلمان بادشاہ پرایا (اکثر) ساہتیہ پریمی ہوتے تھے۔ بابر، ہمایوں، جہانگیر، شاہجہاں اورنگ زیب، دارا شکوہ سبھی ساہتیہ کے مرمگیہ (رمز شناس) تھے۔ سبھی نے اپنے اپنے روزنامچے لکھے ہیں۔ دکھن کے بادشاہوں نے اکثر کویتا میں کہیں اور کویتا کو آشرے دیا۔ لیکن ہندی بھاشا کو موجودہ صورت میں آتے آتے صدیاں گزر گئیں۔

جس طرح ہندوؤں کی ہندی کا وکاس ہو رہا تھا، اسی طرح مسلمانوں کی ہندی کا روپ بھی بدلتا جا رہا تھا۔ لپی (رسم خط) تو شروع سے ہی الگ تھی، زبان کا روپ بھی بدلنے لگا۔ مسلمانوں کی سنسکرتی (تہذیب) ایران اور عرب کی ہے۔ اس کا زبان پر اثر پڑنے لگا۔ عربی اور فارسی کے لفظ اس میں آکر ملنے لگے، یہاں تک کہ آج ہندی اور اردو دو الگ الگ سی زبانیں ہو گئی ہیں۔ ایک طرف ہمارے مولوی صاحبان عربی اور فارسی کے شبد بھرتے جاتے ہیں، دوسری طرف پنڈت گن سنسکرت اور پراکرت کے شبد ٹھونس رہے ہیں۔ اور دونوں بھاشائیں جنتا سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔

کیا یہ طے سمجھ لیا جائے کہ اتر بھارت میں اردو اور ہندی دو بھاشائیں سدا الگ الگ رہیں گی؟ انھیں اپنے اپنے ڈھنگ پر اپنی اپنی سنسکرتی (تہذیب) کے انوسار (مطابق) بڑھنے دیا جائے؟ ان کو ملانے کی اور اس طرح دونوں کی پرگتی (ترقی) کو روکنے

کی کوشش نہ کی جائے؟ یا ایسا سمبھو (ممکن) ہے کہ دونوں بھاشاؤں کو اتنا سمیپ (قریب) لایا جائے کہ ان میں لپی کے سوا کوئی بھید (فرق) نہ رہے۔ بہومت (اکثریت) پہلے نشچے (فیصلہ) کی اور (طرف) ہے۔ ہاں کچھ تھوڑے سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ دونوں بھاشاؤں میں ایکتا لائی جا سکتی ہے یہ لوگ اردو اور ہندی ناموں کا ویوہار (استعمال) نہیں کرتے۔ دونوں کو ایک نام سے پکارتے ہیں اور وہ ہے ہندوستانی۔ ان کا آدرش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لکھی جانے والی اور بول چال کی زبان کی صورت ایک ہو اور وہ تھوڑے سے پڑھے لکھے آدمیوں کی زبان نہ رہ کر ساری قوم کی زبان ہو۔ چونکہ اردو زبان عرصہ سے عدالت اور سبھیہ سماج کی بھاشا رہی ہے اس لئے اس میں ہزاروں فارسی اور عربی کے شبد اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ بجر (ٹھیٹ۔ ان پڑھ) دیہاتی بھی ان کا مطلب سمجھ جاتا ہے۔ ایسے شبدوں کو الگ کر کے ہندی میں ویشدھتا لانے کا جو پریتن (کوشش) کیا جا رہا ہے ہم اسے قوم اور زبان دونوں ہی کے ساتھ انیائے سمجھتے ہیں اسی طرح ہندی سنسکرت یا انگریزی کے جو بگڑے ہوئے شبد اردو میں مل گئے ان کو چن چن کر نکالنے اور ان کی جگہ خالص فارسی اور عربی شبدوں کے استعمال کو بھی اتنا ہی اعتراض کے لائق سمجھتے ہیں۔ ایسی زبان جس کے لکھنے اور سمجھنے والے تھوڑے سے پڑھے لکھے لوگ ہوں مصنوعی بے جان اور بوجھل ہو جاتی ہے جب تک اردو ہندی دونوں بھاشاؤں کا میل نہ ہوگا ہندوستانی زبان کی گاڑی جہاں جا کر رک گئی ہے اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔

(دسمبر ۱۹۳۶ء)